الکلام
Al kalam

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میگزین

نومبر 2015 شمارہ XXI

وہ (مولانا ابوالکلام آزاد) اپنی زندگی میں بھی عظیم تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جیسے جیسے وقت ہماری قومی تاریخ کا حصہ بنتا جائے گا تو ان کی مہربان شخصیت عوام کے دلوں میں اپنی عظمت کے باعث گھر کرتی جائے گی۔ لیکن اپنے اختیار کردہ نظریے کے لیے ان کی پُر فخر شجاعت، بے مثال ایمانداری اور مخلصانہ لگن کے نقوش دھندلے ہو جائیں گے۔ ہمیں ایسا ہونے سے روکنا ہوگا۔ جن لوگوں نے ان کی چھپی ہوئی عظمت و شوکت کو قریب سے دیکھا ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی حیات و خدمات کی پوری دیانت داری کے ساتھ حفاظت کریں۔

(مولانا آزاد کے ایک قلمی خاکے سے اقتباس، جو ان کی وفات کے ایک مہینے بعد 2 مارچ 1958 کو شنکرس ویکلی میں شائع ہوا۔)

مولانا آزاد
خصوصی شمارہ

مولانا ابوالکلام آزاد چیئر

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے 2008 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
میں مولانا ابولکلام آزاد چیئر کے قیام کی منظوری دی۔
مولانا آزاد چیئر نے 12-2011 میں اپنی کارکردگی کا آغاز کیا۔

میدانِ عمل

مولانا آزاد اور صحافت
تعلیم بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں مولانا کی خدمات
ہندوستان میں اردو اور عربی ادب کے فروغ میں مولانا آزاد کا حصہ
تحریک آزادی میں مولانا آزاد کے کردار کے سیاسی/سماجی/تاریخی پہلو
مولانا آزاد کے حوالہ سے بین مذہبی تقابلی مطالعہ
سیکولرزم اور شمولیاتی تعلیم سے متعلق مولانا آزاد کے نظریات
مولانا آزاد کے اقدار

الکلام - مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میگزین
شمارہ 21 ۔ نومبر 2015
پبلک ریلیشنز آفس، گچی باؤلی، حیدرآباد، 032 500، ریاست تلنگانہ
فون فیکس 040-23006606
ویب سائٹ: www.manuu.ac.in
e-mail: editornewsmagazine@gmail.com, manuupro1@gmail.com

ایڈیٹر انچیف: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر

ادارتی پینل

آمنہ کشور میر ایوب علی خان آفتاب عالم بیگ شمس عمران سلمیٰ اشرف

معاونین: آمنہ انجم اور محمد اطہر احمد صدیقی

پرنٹر اینڈ پبلشر: پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
Maulana Azad National Urdu University
(A Central University Established by an Act of Parliament in 1998)
Gachibowli, Hyderabad - 500 032, Phone: 91 040 23006612-15, www.manuu.ac.in

ممتاز کارٹونسٹ شنکر کا مولانا آزاد کو خراج عقیدت

HOMOEO
SHIKSHA PADHYATI
(Principles of Homoeopathy)
(HINDI) Rs. 3-8-0
KING & CO.
90/7A Harrison Road,
CALCUTTA-7

SHANKAR'S WEEKLY

UNICHEM
a trusted name in
PHARMACEUTICALS
UNICHEM LABORATORIES

Vol. 10, No. 42 | NEW DELHI, SUNDAY | March 2, 1958

The Man of the Week

With the patrician aloofness of a snow-clad, rarely approached Everest, Maulana Abul Kalam Azad lived his days, overlooking with classic liberalism a lax society in the throes of establishing a national discipline. He neither asked for nor conceded sentiment, the generosity of his vast understanding being nothing more than a natural aspect of benign wisdom. He shunned popularity because of his intense aversion for vulgarity; but the turning away of his face from the lusting looks of the hero-worshippers had in it no taint of priggishness. All that he would vouchsafe in explanation for absence from occasions of democratic flattery that appealed so much to others was that they were not necessary. But retreating from praise and plaudits, he did not seek in seclusion to construct a self-righteous philosophy of withdrawal. On the other hand, he sought to perfect a modern eclecticism proper to an age of revolution and mount it on a plinth of humanism.

His mind, as exquisitely featured as his physical body, he picked and chose his preferences with aristocratic fastidiousness. "Noblesse oblige" was no affectation in his case but the rendering of a duty to those who were not gifted with his own fine precision of reason. He was legendary even while he lived, and there is no doubt that as the years take their place in the storehouse of our nation's history, his grave and kindly figure will loom with heroic persistence in the people's consciousness. But the details of his proud courage, peerless integrity and steadfast devotion to the path he chose will be blurred. This should be prevented; and his work and life be enshrined in a faithful effort of portrayal by those who knew him intimately in the awe-inspiring grandeur of his seclusion.

He was uniquely great in an epoch full of great Indians, and the elements of his uniqueness if properly explained may temper our national character with its pronounced tendency for laxness and intellectual indiscipline.

A pen sketch of Azad which appeared in *Shankar's Weekly* a month after his demise; 2 March 1958.

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی زندگی تشکیلِ قوم کے تلاطم خیز ماحول میں ایک ناقابل عبور، بلند برف پوش چوٹی کی مانند تنہا اور ایک بے حس سماج کو اپنی کلاسیکل روشن خیالی سے نظرانداز کرتے ہوئے گزاردی۔انہوں نے نہ تو اپنے انتہائی وسیع فہم وفراست کے اعتراف کا مطالبہ کیا اور نہ اس کے لیے وہ حساس تھے بلکہ وہ اسے کریمانہ حکمت کا ایک فطری تقاضہ سمجھتے تھے۔عامیانہ پن سے شدید نفرت کے باعث انہوں نے اپنے آپ کو شہرت سے دور رکھا تھا،لیکن شخصیت پرستوں کے آرزومندانہ نگاہوں سے اپنے آپ کو دور رکھنے میں ان کی مذہبی شدت پسندی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔عوامی زندگی میں خوشامد اور چاپلوسی کے بہت سارے مواقع ،جو دوسروں کے لیے بہت پرکشش ہوتے ہیں،ان سے دور رہنے کی وضاحت میں وہ صرف یہی کہتے تھے کہ یہ سب غیر ضروری ہیں۔لیکن تعریف وستائش سے بچنے کے لیے انہوں نے کوئی گوشہ نشینی اختیار نہیں کی کہ جس کے ذریعے وہ شخصی نیکی کا کوئی منفرد فلسفہ تشکیل دیں۔دوسری جانب انہوں نے اس وقت کے انقلابی دور سے مناسبت رکھنے والے، انتخابِ افضلیت کے ایک جدید نظریے کو تشکیل دینے کی کوشش کی اور اسے انسان پرستی کی بنیادوں پر استوار کیا۔

ان کا ذہن بھی ان کے جسم کی طرح انتہائی دلکش تھا،وہ اپنی ترجیحات کا انتخاب نہایت عمدگی اور باریک بینی سے کرتے تھے۔مولانا کے معاملے میں ان کے ''بڑے ہونے کا احساس ذمہ داری'' کوئی تصنع کا اظہار نہیں بلکہ ان لوگوں کے تئیں ایک فریضہ کی ادائیگی تھی جنہیں ان کی طرح اعلیٰ شعور کی نعمت نہیں ملی تھی۔

وہ اپنی زندگی میں بھی عظیم تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جیسے جیسے وقت ہماری قومی تاریخ کا حصہ بنتا جائے گا تو ان کی مہربان شخصیت اپنی عظمت کے باعث عوام کے دلوں میں گھر کرتی جائے گی۔لیکن اپنے اختیار کردہ نظریے کے لیے ان کی پُرفخر شجاعت، بے مثال ایمانداری اور مخلصانہ لگن کے نقوش دھندلے ہوجائیں گے۔ہمیں ایسا ہونے سے روکنا ہوگا۔جن لوگوں نے ان کی چھپی ہوئی عظمت وشوکت کو قریب سے دیکھا ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی حیات وخدمات کو پوری دیانت داری کے ساتھ محفوظ کریں۔

وہ ایک ایسے دور میں بھی منفرد طور پر عظیم تھے جو عظیم لوگوں سے آباد تھا۔اور اگر ان کی اس انفرادیت کے عناصر کی مناسب انداز سے تفہیم کی جائے تو وہ ہمارے قومی کردار کو بہتر بنا سکتے ہیں جس میں تساہل اور فکری انتشار واضح طور پر نظر آتا ہے۔

مولانا آزاد کا ایک قلمی خاکہ جو آپ کی وفات کے ایک مہینے بعد 2 مارچ 1958 کو ہفتہ وار شنکر میں شائع ہوا تھا۔

شیخ الجامعہ کے قلم سے

مولانا آزاد کی عصری معنویت

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

عزیز ساتھیو!

میں یونیورسٹی میگزین 'الکلام' کے ذریعے آپ سے پہلی بار مخاطب ہو رہا ہوں۔ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کی 127ویں یوم پیدائش کے موقع پر شائع ہونے والا خصوصی شمارہ ہے جو اس سلسلے کی دوسری اشاعت ہے۔ اس نوعیت کا پہلا شمارہ نومبر 2014 میں شائع کیا گیا تھا۔ یہ خصوصی شمارہ یوم آزاد تقاریب کا ایک جزو ہے جو اس سال 4 نومبر سے 13 نومبر کے دوران منائی جا رہی ہیں۔

آج، جب کہ ہمارا ملک ہندوستان کئی چیلنجز کے باوجود ترقی کے اگلے مرحلے میں داخل ہونے کے لیے تیار ہے، ہمیں ان دور اندیش قائدین کو یاد رکھنا چاہیے جنھوں نے انگریزوں کی غلامی سے آزادی سے کافی پہلے انتہائی مستحکم بنیادوں پر اس ملک کی تعمیر و تشکیل کا آغاز کیا تھا۔

قومی قائدین کی اس کہکشاں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ مولانا آزاد کا نام اُن چند اہم قائدین میں سرفہرست ہے جنھوں نے ملک کو نہ صرف ترقی کے راستے پر گامزن کیا بلکہ اس کے لیے انسان دوستی، ہم آہنگی اور رواداری کے راستے کا تعین بھی کیا۔

مولانا آزاد جدوجہد آزادی کے ایک قدآور رہنما تھے، لیکن ان کی شخصیت جدوجہد آزادی میں شامل ان کے تمام نمایاں ساتھیوں میں بھی بالکل منفرد تھی۔ گرچہ ان کی پیدائش و پرداخت ایک قدامت پسند مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی اور انہوں نے کوئی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی لیکن اس کے باوجود وہ ہندو مسلم اتحاد کے ایک عظیم علم بردار بن کر ابھرے۔ اپنی مسلم شناخت کا بھرپور شعور رکھنے کے باوجود انہیں اپنے 'ہندوستانی' ہونے پر بڑا فخر تھا جس کا اظہار وہ تمام مذاہب کے ماننے والے ہم وطنوں کے سامنے بھی کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح غیر رسمی طریقے سے حاصل کی جانے والی روایتی اسلامی تعلیم انہیں جدید مغربی علوم کے حصول سے نہیں روک پائی۔

مولانا آزاد کی شخصیت روایتی اور جدید تعلیم کا ایک حسین امتزاج تھی، جہاں یہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی تھے اور ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتے تھے۔ جیسا کہ مولانا آزاد کی وفات پر پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا تھا کہ ''انہوں نے اپنے اندر ماضی کی عظمت کو حال کی عظمت کے ساتھ یکجا کر دیا تھا''۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ ماضی اور مستقبل، روایت اور جدیدیت اور مذہب اور سیاست کے متعلق غیر واضح و مبہم بحثیں ملک میں جاری ہیں، مولانا آزاد کی حیات اور ان کے افکار ملک و قوم کے لیے روشنی کا ایک مینار ثابت ہو سکتے ہیں۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی اور آل انڈیا کونسل آف ٹکنیکل ایجوکیشن جیسے اہم ترین ادارے قائم کیے۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ ثقافتی روابط کو مستحکم کرنے کی خاطر قائم شدہ ادارہ انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کی بنیاد بھی مولانا آزاد نے اپنے دور وزارت میں ہی رکھی تھی۔ انہوں نے فنون لطیفہ کے فروغ کے لیے تین اہم قومی سطح کی اکیڈمیاں، سنگیت ناٹک اکیڈمی، ساہتیہ اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی بھی قائم کی تھیں۔

اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ پچھلے چند دہوں کے دوران ہونے والی ہندوستان کی ترقی، دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ، مولانا آزاد کی جانب سے فراہم کیے جانے والے مستحکم تعلیمی نظام کا نتیجہ ہے جو انہوں نے آزادی کے فوری بعد تشکیل دیا تھا۔

اپنی وزارت کے دوران مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کے تعلیمی شعبے میں جن مسائل و چیلنجز کی نشاندہی کی تھی ان کی معنویت آج بھی اسی طرح باقی ہے۔ مولانا نے سب کے لیے لازمی تعلیم کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کچھ عرصہ قبل 'قانون حق تعلیم - 2009' کی صورت میں سامنے آئی۔ گرچہ ہمارے ملک نے شرح خواندگی کے معاملے میں کافی ترقی کی ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

مولانا آزاد نے تکنیکی تعلیم کی اہمیت کو بھی بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ وہ تکنیکی و ماہر افرادی قوت کے معاملے میں ہندوستان کو خود مکتفی بنانا چاہتے تھے۔ اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں وہ اس خیال کے سخت حامی تھے کہ مادری زبان کے سوا کسی اور زبان میں تعلیم دینا بچے کے ساتھ ناانصافی ہے۔

مولانا آزاد کے نزدیک تعلیم محض روزگار اور حصول معاش کا ذریعہ نہیں تھا۔ وہ بنیادی طور پر اسے اپنے ہم وطنوں کے قلب و ذہن کی تبدیلی، ان میں جمہوی اقدار، سیکولرزم اور رواداری کے جذبات کو پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ تعلیم کے متعلق اسی وسیع اور انسان دوست نقطہ نظر کو مولانا آزاد نے ہندوستان کے تعلیمی نظام پر ایک طویل عرصے کے لیے ثبت کر دیا تھا اور اس کے فوائد ہمارا ملک مستقبل میں بھی حاصل کرتا رہے گا۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ یہ ملک کے اسی عظیم سپوت کے نام پر قائم کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ہمارے لیے ایک چیلنج بھی ہے کہ ہم ان کے نام کے ساتھ انصاف کریں۔ دوسرے لفظوں میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حصول علم کے اسی جذبے کو فروغ دینے کے لیے جدو جہد کرے، اپنے مقاصد کے تئیں اسی طرح مخلص رہے اور کمزوروں کے لیے اسی طرح فکرمند رہے جس کا مظاہرہ مولانا آزاد کی زندگی میں ہمیں ملتا ہے۔ یہ یونیورسٹی مولانا آزاد کے پیش کردہ افکار کو نہ صرف فروغ دے بلکہ یہ ان کی علامت بن جائے۔ سائنسی مزاج، جمہوریت، رواداری اور مذہبی ہم آہنگی ہمارے لیے رہنما اصول ہوں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چار اہم مقاصد ہیں: اردو زبان کا تحفظ و ترقی، کیمپس و فاصلاتی طرز سے تعلیم کی فراہمی، اردو میڈیم میں تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیم کی فراہمی اور خواتین کو عزت و احترام کے ساتھ حصول تعلیم میں تعاون۔ یہ چاروں مقاصد مولانا آزاد کی تحریروں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ان لوگوں کے لیے تعلیم فراہم کرتی ہے جن کی مادری زبان اردو ہے اور جو اس دل کش زبان میں اپنی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ خواتین کے تئیں دل چسپی یونیورسٹی کا ایک اور مقصد ہے کیوں کہ یہ خواتین کو اپنے علمی اہداف کے حصول کی خاطر ایک محفوظ، پرامن اور تعلیمی ماحول فراہم کر رہی ہے۔ یونیورسٹی اپنے آئی ٹی آئی اور پالی ٹکنک اداروں کے ذریعے تکنیکی مہارتوں کے فروغ پر بھی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔

اعلیٰ تعلیم کا کوئی بھی ادارہ الگ تھلگ ماحول میں نہیں رہ سکتا یہ اس سماج کا ایک جزو لاینفک ہوتا ہے جس میں یہ کام کرتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک یونیورسٹی نہ صرف سابقہ و موجودہ علم کا مرکز اور نئے علوم کی تخلیق کا منبع ہوتی ہے بلکہ اسے بحران کے وقت میں سماج کی رہنمائی کا کام بھی انجام دینا ہوتا ہے۔ اسی لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ وسیع پیمانے پر سماج تک پہنچے اور نئی نسل کو مولانا آزاد کے افکار عالی سے روشناس کرائے۔ اس سے یقینی طور پر ملک میں جاری سماجی، سیاسی و مذہبی مباحثے کے کئی گرہوں کو کھولنے میں مدد ملے گی۔

نظام شمسی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں

''نظام شمسی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں، مگر تم کو ان کا حال نہیں معلوم! تم کو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے، تو نہیں معلوم، عالم انسانیت کے نظام و مراکز کے کشف کے لیے کتنا زمانہ درکار ہوگا! تاہم یہ معلوم رہے کہ ہر عہد و دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے؛ اور جس طرح نظام شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اسی لیے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے، اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اسی لیے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں۔ زمین والوں ہی پر موقوف نہیں، آسمانوں میں بھی صرف انہی کے ناموں کی پکار ہوتی ہے۔''

نوجوانانِ ہند اور مولانا آزاد کا پیغام

آمنہ کشور

محی الدین احمد (1888-1958) جو بعد میں دنیا بھر میں مولانا آزاد کے نام سے مشہور ہوئے، ابتدا ہی سے دوسروں سے مختلف تھے۔ ان کا بچپن انوکھا، لڑکپن سادہ اور نوجوانی ایک متجسس انسان کی تھی جو ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا جسے نہایت عقیدت واحترام سے دیکھا جاتا تھا۔ مولانا آزاد کی شخصیت کے گوناگوں اور اتنے قابل قدر پہلو ہیں کہ ایک عام انسان میں ان کا پایا جانا ناممکنات میں سے ہے۔ ان کے بہت سے بزرگ ہم عصر اتنی کم عمری میں مولانا آزاد کا بے پناہ علم دیکھ کر مبہوت رہ جاتے تھے۔ مولانا آزاد کا سن شعور تک پہنچنے کا سفر مسائل اور کرب واضطراب سے خالی نہ تھا۔ اپنی نوجوانی کے ایام میں وہ اپنے آپ سے سوال کرنے کے گہرے عمل سے گزرے۔ وہ ایک ایسے دور سے بھی گزرے جس میں ایک مخصوص طرز زندگی کے تئیں خود سپردگی کی توقعات کے خلاف ردعمل نے انھیں باغی بنا دیا اور یہ جذبۂ بغاوت ارتداد کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کسی بات کی تصدیق کیے بغیر اسے ماننے کے قائل نہ تھے۔ اپنی زندگی کے ان ادوار کے بارے میں مولانا آزاد نے خود ہی مختلف مواقع پر بتایا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے مثالیت پسند والدین کی توقعات کے برخلاف اور اپنی خاندانی روایت سے بغاوت کر کے ہی اردو پر عبور حاصل کیا۔ لیکن مولانا آزاد کی بغاوت پسند طبیعت ان کے والدین کے لیے کبھی چنوتی نہیں بنی۔ ان کی مختلف خود سوانحی تحریروں میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے اصولوں یا اس روایتی نظام جس میں وہ پیدا ہوئے تھے، کو زک پہنچائے بغیر آزادانہ طور پر خاموشی کے ساتھ اپنے خوابوں کو سچ بنانے کی جستجو میں مصروف رہے۔

مولانا آزاد مختلف محاذوں پر سرگرم رہ کر خود شناسی کے عمل سے گزرے۔ (ان کی خود شناسی کا یہ سفر بے حد دلچسپ ہے۔ یہ ایک مشکل عمل بھی ہے کیونکہ مولانا آزاد نے اپنے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ حالانکہ وہ بظاہر زود گو بھی تھے اور زود نویس بھی)۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ مولانا آزاد نے اپنے والد کے اس مضبوط موقف کے برعکس کہ اردو اعلیٰ اور اشرافیہ طبقے کی زبان نہیں ہے اور نہ ہی یہ ایک عالمانہ زبان ہے، اردو پر عبور حاصل کیا۔ اگرچہ ان کا خاندان نہایت قدامت پسند تھا اس کے باوجود وہ موسیقی سے شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے خاندان کی ان روایات کو اپنانے سے انکار کیا جنھیں ان کا ذہن صحیح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مولانا آزاد کی تقریروں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے متعلق ان کے جو خیالات سننے کو ملتے ہیں، اپنی خود سوانحی تحریروں میں اندھی تقلید کے تئیں انھوں نے جس ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور اپنی صحافیانہ تحریروں میں انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کی فکری ترقی کی جو خواہش کی ہے یہ تمام چیزیں ان کی اسلامی اصولوں اور عقیدے کی گہرے سمجھ کی غماز ہیں۔ جدوجہد آزادی کے دوران بار بار متنازع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ہمیشہ نہ صرف ٹکراؤ سے بچے بلکہ بدنیتی یا کینہ پروری پر وقار اور ناپسندیدگی پر علیحدگی یا تنہائی کو ترجیح دی۔ مجلسی آدمی ہونے کے باوجود وہ تنہائی کا شکار تھے۔ اس صورت حال میں بھی انھوں نے اعلیٰ پائے کا طنز ومزاح پیش کیا۔ ان کے بہت سے قریبی ساتھیوں نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں بتایا ہے۔ آزاد نے اپنے مزاج کی اس خصوصیت کے بارے میں بھی بعض اوقات بیان کیا ہے کہ انھوں نے اپنے میدان عمل اور کاموں کے ایک پہلو کو دوسرے پہلو سے الگ رکھا۔ یہ خوبی کئی 'آزادوں' کے تصور کی وضاحت کرتی ہے جس میں ایک آزاد دوسرے سے بالکل الگ ہے۔

آزاد کے افکار کی وسعت ان کے اسفار، مختلف ذات، مذہب اور نسل کے لوگوں سے تعلق اور ان سب سے بڑھ کر ان کے کثیر مطالعے کا مرہون منت ہے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں سے نہ صرف ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک صحیح اور آزاد فکر کے مالک تھے۔ وہ اس قدر بالغ الذہن تھے کہ صحیح اور غلط میں فوراً امتیاز کر لیتے تھے اور اس پر قائم رہتے تھے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت ساری ایسی شخصیات پیدا ہوئیں جنھیں ان کے علم، جمہوری مزاج، حب الوطنی اور ایثار پسندی کے لیے جانی جاتی ہیں۔ ان تمام عظیم شخصیات اور عوام کے درمیان نمایاں مقام کے حامل لوگوں میں مولانا آزاد شاید سب سے اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے۔ وہ تاعمر بلند آہنگ، نرم خو اور پر وقار رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک باذوق انسان تھے۔ نفاست، مشرقی طرز، عالمانہ اندازِ بیان اور پر وقار انداز اور ان سب سے بڑھ کر بہترین ترسیلی

صلاحیت ان کی شخصیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ان کا ادبی ذوق،ان کی پسندیدہ کتب (جن میں مغربی فلسفہ،مشرقی علوم،شاعری اور افسانوی ادب شامل ہیں) ان کے علم کی وسعت اور زندگی سے متعلق ان کی فہم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

جس انداز میں انھوں نے ''غبار خاطر'' میں اچھی چائے اور اچھی سگریٹ کی اپنی کمزوری کے بارے میں لکھا ہے وہ اتنا دلچسپ ہے کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔وہ اپنی زندگی کی تمام چیزوں میں چائے کے پیالے کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ان کی چائے نوشی بالکل منفرد قسم کی تھی۔انھوں نے چائے بنانے کے عمل کا ذکر اتنے مسرت آمیز لہجے میں کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کوئی مقدس فریضہ ہے یا کوئی نہایت سنجیدہ رسم۔وہ اپنے عزیز دوست نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی (غبار خاطر کے خطوط میں جنھیں صدیقِ مکرم کہا گیا ہے) کو جو سب سے اچھا تحفہ دینا چاہتے تھے وہ ان کی پسندیدہ چائے کا پیکٹ تھا جسے بے حد احتیاط اور اہتمام کے ساتھ بھیجا گیا۔آزاد نے جس دلچسپی کے ساتھ قلعہ احمد نگر جیل کے پیڑ پودوں، جانوروں اور پرندوں کا ذکر کیا ہے، موسیقی کی تفصیلات بیان کی ہیں، پرانی کتابوں کی ایک دکان میں جانے کے بارے میں لکھا ہے، یہ تمام تفصیلات واقعاتی انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب ان کے دل سے قریب ہیں اور ان کا ذکر کر کے وہ تازگی اور فرحت محسوس کرتے ہیں۔یہ یادیں انھیں تنہائی میں سکون عطا کرتی ہیں۔آزاد کی ادبی تحریروں کی کثیر تعداد دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ان کی بہترین تحریریں ایامِ اسیری کی یادگار ہیں۔

اگر ہم ہندو مسلم مسئلہ پر مولانا آزاد کے دلائل کی ردِ تشکیل کریں تو چند دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اختلافات کے باوجود ایک ساتھ رہنا ممکن ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اپنے مذہب پر فخر آپ کو دوسرے مذہب کا احترام کرنے میں مانع نہیں ہوتا ہے۔انھیں نہ تو اپنی خاندانی وراثت پر جھوٹا گھمنڈ تھا نہ ہی انھوں نے کسی کی بے جا تعریف کی۔باہم وجود کا ان کا تصور تصادمی کے بجائے شمولیتی یعنی ایک دوسرے کا خیال رکھنے والا تھا۔

مولانا آزاد کے پرستاروں کے لئے یہ بات تکلیف دہ ہے کہ تحریک آزادی کے آخری ایام اور اقتدار کی منتقلی کے اختتامی مراحل میں مولانا آزاد کو یا تو نظر انداز کیا گیا یا انھیں حاشیے پر رکھنے کی کوشش کی گئی۔جو لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ تقسیم ملک پر مولانا آزاد کا کیا رُخ تھا اور متحدہ ہندوستان کا ان کا خواب کس طرح شکست خواب بن گیا ان کے لئے ان کی بڑھتی ہوئی تنہائی پسندی اور عوامی زندگی سے کنارہ کشی کے اسباب کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔اگرچہ تقسیمِ ملک کے سانحے نے انھیں بری طرح دل شکستہ کر دیا تھا لیکن انھوں نے ایک نہایت اہم وزارت کا قلمدان بے حد فعال اور احسن طریقہ سے سنبھالا اور ثقافتی اعتبار سے ثروت مند، کامل اور انسانیت پر مبنی تعلیمی نظام کی بنیاد ڈالی۔وہ ایک ایسے تعلیمی نظام کے خواہاں تھے جو عوام دوست ہو اور جو ملک کی ثقافتی بنیادوں پر کھڑا ہو۔

آج کے نوجوانوں کو مولانا آزاد کو ایک ایسے روشن مینارے کے طور پر دیکھنا چاہیے جن میں ذہن و قلب کی وہ تمام خصوصیات مجسم ہو گئی تھی جن سے ایک مکمل انسانی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔علم کے مختلف میدانوں مثلاً تاریخ، فلسفہ اور سائنس پر ان کے عبور، مختلف زبانوں اور ادبیات پر ان کی قدرت، نرم روی اور باضمیری، اخلاقی جرأت اور سماج کو انسانیت کے اصولوں کی روشنی میں دیکھنے کی بصیرت وغیرہ وہ خوبیاں ہیں جو آج ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔مولانا آزاد جیسی شخصیات نایاب ہیں۔یہ دیکھنا آسان ہے کہ مولانا آزاد جیسی ہمہ جہت اور کامل شخصیت دراصل پوری عمر علم کی جستجو اور اپنے زمانے کے ذہین ترین لوگوں سے مذاکرے اور ان کی کتابوں کے مطالعے کی بدولت وجود میں آئی۔جیسا کہ وویکانند نے کہا تھا ''تعلیم انسان سازی، کردار سازی اور مختلف تصورات کو مجتمع کر کے زندگی کو سنوارنے کا عمل ہے''۔

ہم تاریخ میں مولانا آزاد کے کردار کا خاصا تجزیہ کر چکے ہیں۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نوجوان مولانا آزاد کی خالص انسانیت کو ایک نمونے کے طور پر دیکھیں اور ان کی تقلید کریں۔

مولانا آزاد کی خدمات کے آثار رانچی میں آج بھی موجود

آفتاب عالم بیگ

انگریزوں کے خلاف الہلال اور البلاغ کی ولولہ انگیز تحریروں، مولانا کے ذریعہ قائم کردہ حزب اللہ سوسائٹی کا ''مشکوک'' کردار، انھیں کے قائم کردہ دارالارشاد، کلکتہ میں کی گئی ''باغیانہ'' تقریروں اور مرکزی حکومت کے خلاف ایک خطرناک سازش میں ملوث ہونے کے الزام میں مولانا آزاد کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبہ بنگال سے باہر جانے کا حکم دے دیا گیا۔ ملک کے بیشتر صوبوں میں ان کی آمدورفت پر پابندی لگادی گئی تھی لیکن صوبہ بہار اس میں شامل نہیں تھا۔ لہٰذا مولانا آزاد کو کلکتہ سے رانچی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ رانچی اس وقت ریاست بہار کا حصہ تھا۔ حکومت ہند کی ہدایت کی روشنی میں صوبائی حکومت نے مولانا کو رانچی میں قیام کی اجازت دی تھی۔

5/اپریل 1916 کو رانچی میں مولانا آزاد کی آمد ہوئی۔ 'ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ 21/اپریل کی صبح مولانا ڈاک بنگلے سے مولوی عبدالکریم، ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکول، حکومت بنگال کے مکان واقع مورابادی منتقل ہوگئے جو جامع مسجد کے قریب تھا۔ مولانا کے رانچی قیام کے دوران درجِ ذیل شرائط کی پابندی لازم قرار دی گئی تھی۔

۱۔ وہ ڈپٹی کمشنر رانچی کی اجازت کے بغیر رانچی نہ چھوڑیں۔ ان کی جانب سے معقول وجہ بتانے پر ہی یہ اجازت منظور کی جائے گی۔

۲۔ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو ترک کریں سیاسی جلسوں میں شرکت نہ کریں اور نہ ہی سیاسی شورشیوں سے کوئی رشتہ رکھیں اور نہ ان سے کسی بھی حالت میں مراسلت قائم رکھیں۔

۳۔ جب تک وہ رانچی یا اس صوبے میں جہاں کہیں بھی رہیں اپنے درست سلوک کی مناسب ضمانتیں دیں۔

۴۔ دوسرے مقامات سے آنے والے ملاقاتیوں کی شناخت، پتے اور ان سے ملاقات کے مقصد کے بارے میں وہ ضروری معلومات پولیس کو فراہم کریں، جب یہ ان سے دریافت کی جائیں۔

رانچی کی مسجد جہاں مولانا آزاد خطبۂ جمعہ دیا کرتے تھے۔

رانچی میں مولانا آزاد جامع مسجد میں نماز ادا کرتے تھے اور وہیں پر جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر مسجد میں بیان کرنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ کبھی عصر اور کبھی مغرب کے بعد ہوتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے سورۂ فاتحہ اور سورۂ یوسف کی تفسیر بہت دنوں تک بیان کی۔ مولانا کا یہ عظیم کارنامہ بعد میں ترجمان القرآن کی شکل میں ظاہر ہوا۔

یہیں سے مولانا کے اندر ایک مدرسے کے قیام کی تحریک پیدا ہوئی۔ مدرسے کے لیے شہر اور دیہات سے چندے جمع کیے گئے۔ اسی دوران مولانا نے کلکتہ میں اپنا پریس فروخت کردیا اور اس کی رقم مدرسے کی عمارت بنانے میں صرف کی۔ مدرسے کے لیے منشی ظہورالحق صاحب نے اپنی زمین دی تھی جو مسجد کے قریب ہی تھی اور جس پر لکڑی کا کاروبار ہوا کرتا تھا۔

ان دنوں رانچی ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کی بڑی آبادی بے حد پسماندہ تھی۔ عیسائیوں کی تبلیغی مشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے مقامی آبادی میں تعلیم پائی جاتی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو لوگ تعلیم یافتہ تھے وہ عام طور پر دوسری جگہوں سے آکر آباد ہوئے تھے۔ کچھ سرکاری ملازم اور کچھ وکیل، ڈاکٹر یا تاجر پیشہ افراد تھے۔ مجموعی صورتحال اچھی نہیں تھی۔ مولانا کے وہاں پہنچتے ہی لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ البتہ کچھ پڑھے لکھے لوگ دلوں میں عقیدت رکھنے کے باوجود اُن سے دور رہتے تھے کیونکہ مولانا حکومت کی نظر میں ''خطرناک'' آدمی تھے۔ ان حالات میں مولانا نے مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ رانچی کے مسلمانوں کی عام آبادی غریب تھی۔ مدرسے کے لیے فنڈ جمع کرنا مقامی طور پر تقریباً ناممکن تھا پھر بھی مولانا نے جب جب اپیل کی تو اکثر مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان کی آواز پر لبّیک کہا۔ مولانا کے کلکتہ کے دوستوں اور عقیدت مندوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مدرسہ میں چندہ دہندگان کی ایک طویل فہرست پتھر پر کندہ ہے۔ اس میں ایسے

رانچی کا پولیس اسٹیشن جہاں مولانا آزاد حاضری دیا کرتے تھے۔

لوگ بھی تھے جنھوں نے مدرسے کی تعمیر میں انتھک محنت کی ہے مگر ان کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ چندہ دہندگان کی فہرست میں آتے۔ مولانا نے ان کی طرف سے جیب خاص سے روپے دیے اور ان کا نام کندہ کروایا۔

جمشید قمر اپنی مرتب کردہ کتاب ''مولانا آزاد کا قیام رانچی۔ احوال و آثار'' میں لکھتے ہیں کہ مدرسے کے اولین اساتذہ میں مولانا مظہر الحق صاحب، شہید ایڈیٹر الامان اور مولانا محمد یوسف صاحب رمضان پوری اور ایک مصری عالم بھی تھے۔ مولانا اکثر و بیشتر مدرسہ تشریف لاتے اور کبھی کبھی بچوں کے کلاس میں بیٹھ کر بچوں کو مٹھائیاں دیتے، سبق پوچھتے، حروف شناسی کرواتے، دو ایک کو پڑھا بھی دیتے۔

مدرسہ کی تعمیر سے فراغت حاصل ہوئی تو مولانا آزاد نے مسلمانوں کی ضروریات کے پیش نظر ایک انجمن کی بنیاد ڈالی اور اس میں جامع مسجد، عیدگاہ اور قبرستان کے انتظام کو بھی شامل کرلیا۔ یہی انجمن آج بھی ''انجمن اسلامیہ'' رانچی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اسی انجمن کے تحت مولانا نے اجتماعی طور پر زکوٰۃ وصول کرنے کا انتظام کیا تھا جس کی رقم مدرسہ کے علاوہ دیگر مصارف پر بھی خرچ کی جاتی تھی۔

رانچی میں قیام کے دوران مولانا آزاد کی دیگر بہت سی مصروفیات کے باوجود ''تذکرہ'' اور ''ترجمان القرآن'' ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ ان دنوں مولانا آزاد کو نہ صرف رانچی بلکہ سارے ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ مولانا نے جو ماہ و سال رانچی میں گزارے اس کی کوئی ساعت رائیگاں نہیں ہوئی۔ وہاں کے مسلمانوں میں تعلیم اور دینداری کے علاوہ ایک طاقتور قومی رجحان پیدا کرنا مولانا آزاد کا ایسا بڑا کارنامہ تھا جس کا اثر دیرپا ثابت ہوا۔

درحقیقت مولانا آزاد کے لیے رانچی میں مسجد اور مدرسہ بہت اہم مقامات رہے ہیں۔ ان کی فکر و عمل کے لیے یہ دونوں مقامات ایک نئی جولانگاہ ثابت ہوئے۔ نظر بندی کے دوران انھوں نے کام کرنے کا ایک بہترین نمونہ انھیں مقامات سے پیش کیا۔ یہی وہ مقامات ہیں جو وہاں کے مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کی اصلاحات اور درستگی کا ذریعہ رہے اور مدرسے کے لیے ان کے مرتب کردہ نصاب تعلیم اور ان کے تعلیمی مشن کا وسیلہ ثابت ہوئے۔

پروفیسر وہاب اشرفی، خدا بخش جرنل 1991 میں لکھتے ہیں کہ:

''..... یہ تو سچ ہے کہ ان کا خواب کُلی طور پر شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا، لیکن رانچی میں آج بھی جتنی کچھ سرگرمیاں ہیں، دراصل ان کی بنیاد کے عقبی زمین میں مولانا کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔''

مرکزی وزیر اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ نے 20/اگست 2015 کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں منعقد ''تعلیم کی طاقت'' پروگرام میں اعلان کیا ہے کہ مولانا آزاد کے قائم کردہ اس مدرسے کو حکومت نے قومی ورثہ قرار دیا ہے۔ جس کے اخراجات حکومتِ ہند برداشت کرے گی۔ حکومت کے اس اقدام سے مولانا آزاد کے کارناموں اور ان کے احوال و آثار کو قائم رکھنے میں مدد ملے گی۔

مولانا آزاد کے قیام رانچی کی اہمیت پر رشید الدین خاں ایک کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد، تعلیم سیاست، پیغام'' ص 30، مشمولہ، مولانا آزاد کا قیام رانچی۔ احوال و آثار (جمشید قمر) میں لکھتے ہیں:

''یہ وقفہ، وقفۂ فکر و تجسس اور فرصت تنقید و تشخیص بھی تھا۔ مولانا جب رانچی جاتے ہیں تو ان کی شخصیت کا ایک رومانی اور جذباتی پہلو اُجاگر تھا اور جب رانچی سے لوٹتے ہیں تو شخصیت کا ایک نیا، پختہ مغز، اور سیاسی بلاغت کا پہلو ابھرتا ہے۔ عمر کے لحاظ سے بھی یہ درمیانی دور عہد نوجوانی کے ختم اور عہد شباب سیاسی کے آغاز کا ہے۔ یہ وقفہ الہلال اور البلاغ کی ولولہ انگیز اسلامیات سے ماورا ترجمان القرآن کی گہری بصیرت اور اجتہاد اور تحریک خلافت اور کانگریس کی سنجیدہ قیادت کا پیش خیمہ تھا۔''

رانچی میں نظر بندی کے دوران دور دراز مقامات تک لوگوں کے دلوں میں مولانا آزاد سے والہانہ لگاؤ، محبت اور ایثار کے جذبے کا نمونہ خود مولانا کی 12/ستمبر 1931 کی ایک تحریر سے ملاحظہ فرمائیے:

''غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا، کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک

شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا؛

''آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں جناب! میں بہت دور سے آیا ہوں۔''

''کہاں سے''

''سرحد پار سے''

''یہاں کب پہنچے؟''

''آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے۔ انہوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔''

''افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟''

''اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال اور البلاغ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔''

یہ شخص چند دنوں ٹھہرا' اور پھر یکا یک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اُسے اندیشہ تھا' میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں لیکن اگر میرے حافظہ نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اسی کے نام سے منسوب کرتا۔''

جمشید قمر نے ''احوال و آثار'' میں مولانا کی رانچی کی زندگی کا محاکمہ اس طرح کیا ہے:

''مولانا آزاد نے رانچی میں اپنے قیام کا جو زمانہ گذارا' اس میں ان کی بیشتر محنت و خدمت' تعلیم کے صیغے میں صرف ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے یہاں کی جامع مسجد اور اپنے ذریعہ قائم کردہ مدرسہ کو مقامی مسلمانوں کی اصلاح و بیداری اور غیر مسلموں کے درمیان دعوت و تبلیغ کا مرکز بنایا۔ اس کے وسیلے سے غالباً پہلی بار' غیر مسلموں سے براہِ راست ربط و تعلق اور ان کے درمیان یک جہتی اور یگانگت کے رشتوں کے کئی مظاہر' ہمیں اس مقام پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

رانچی کے مسلمانوں میں ملی بیداری اور قومی میلان کو پروان چڑھانے میں' مولانا آزاد کی انفرادی کوششوں اور محنتوں کو خاص طور پر دخل رہا' یہاں پر ان کے قیام کے زمانے میں ان کی نشانیاں ظاہر ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ یہاں سے ان کی روانگی کے بعد کافی عرصہ تک رانچی کے مسلمانوں میں ملی اور قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کافی مثالیں ملتی ہیں۔ مدرسہ اسلامیہ رانچی' جنگ آزادی کے زمانے میں قومی تحریکات کا بے حد فعال اور مضبوط مرکز بنا رہا۔ یہ مولانا آزاد کے پرتوِ صحبت کا فیض تھا' جو اس مقام کو حاصل ہوا۔

رانچی میں تعلیمی کانفرنسوں کے انعقاد کے ذریعہ بنگال اور دیگر صوبوں خاص طور پر بہار کے علماء اور اصحاب نظر کو مولانا آزاد نے قدیم تعلیم کی اصلاح اور نئی تعلیم کے فروغ کے کاموں کی طرف توجہ دلائی۔ ساتھ ہی علماء کی ایک انجمن اور امارت شرعیہ کے قیام کا ایک خاکہ بھی ان کے سامنے پیش کیا.....''

رانچی میں مولانا آزاد کا قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ کی حفاظت کے لیے متعدد اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اسی کے تحت مولانا آزاد کالج بھی قائم کیا گیا۔ حکومت نے بھی مولانا سے وابستہ مختلف آثار کے تحفظ کی جانب دلچسپی دکھائی ہے۔ رانچی میں دیگر مقامات پر واقع مولانا آزاد سے متعلق اشیا' ان کی باقیات اور ان سے وابستہ مقامات کا تحفظ کیا جا رہا ہے۔

رانچی میں مولانا آزاد کا قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ

''سنہ ۱۶ میں جب بنگال سے مجھے خارج کیا گیا اور رانچی گیا تو یہ وہ وقت تھا کہ البلاغ اور دارالارشاد کی مشغولیت کے ساتھ میں نے اپنے افکار و تحقیقات کی تحریر و ترتیب بھی شروع کر دی تھی۔ جن امور کی تکمیل و ترتیب پیش نظر تھی، وہ کسی ایک ہی موضوع سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بے شمار گوشے سامنے آتے تھے، اور ہر گوشہ سے نظر میں اس کثرت سے متفرق اور منتشر حقیقتیں نمایاں ہوتی تھیں کہ ان سب کا جمع کرنا اور اصول و کلیات کے ماتحت لانا آسان نہ تھا... برسوں سے دماغ اس کا عادی ہو گیا ہے کہ ہمیشہ کسی نہ کسی گوشۂ تحقیق کی فکر اور کسی نہ کسی عقدۂ کار کے حل میں مشغول رہتا ہے۔''

مولانا آزاد کی ایک تحریر

'قول فیصل' نیشنلزم پر مولانا کا پراثر خطبہ

مولانا آزاد کو 10 ردسمبر 1921 بروز جمعہ کلکتہ میں گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری کے بعد مولانا پر مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمے کے دوران مولانا آزاد نے کورٹ میں جو معرکتہ الآرا بیان دیا اسے دنیا ''قول فیصل'' کے نام سے جانتی ہے۔ یہ بیان 159 صفحات پر مشتمل ہے اور مولانا آزاد کی تحریروں میں اس کو ایک منفرد مقام حاصل ہے:

''قول فیصل'' کا آخری حصہ:

''مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا ہے۔ تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کریں۔ مورّخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔''

والحَمدُ لِلّٰہِ اَوَّلاً وَّ آخِراً ط

۱۱رجنوری ۱۹۲۲ء پریذیڈنسی جیل۔علی پور، کولکتہ

ابوالکلام آزاد (قولِ فیصل مولانا ابوالکلام آزاد)

قولِ فیصل پر گاندھی جی کا درج ذیل تبصرہ

''مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جو بیان عدالت میں دیا۔ اس کی نقل میرے پاس پہنچی۔ مولانا کے بیان میں بہت بڑی ادبی خوبصورتی ہے۔ وہ نہایت وسیع روانی کے ساتھ پُر جوش بھی ہے۔ وہ نہایت دلیرانہ ہے۔ اس کا لہجہ غیر متزلزل اور غیر آشتی طلب ہے۔ uncompromising مگر ساتھ ہی سنجیدہ اور متین بھی ہے۔ تمام بیان میں اول سے آخر تک ایک پُر جوش اثر پایا جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا خلافت اور نیشنلزم پر مولانا ایک پُر اثر خطبہ دے رہے ہیں۔

مولانا کا بیان پڑھ کر جب میں فارغ ہوا، تو ایک بات بہت زیادہ واضح ہو کر میرے سامنے آ گئی۔ یعنی عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے کی اصلی ضرورت کیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ بے خوفی اور مضبوطی ہم میں کہاں ہوتی جو آج ہمارے اندر کام کر رہی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر ہم نے عدالتوں کا بائیکاٹ نہ کیا ہوتا تو ہم کو آج مولانا کے بیان جیسی گراں قدر چیز نہ ملتی، جو بجائے خود ایک بہترین سیاسی تعلیم ہے۔

عدالتوں کے بائیکاٹ کا اثر صرف اسی چیز میں نہیں دیکھنا چاہیے کہ کتنے قانون پیشہ اصحاب نے پریکٹس چھوڑ دی؟ اصلی چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ آج سے دو سال پہلے جو ہماہمی اور رونق عدالت گاہوں کے اندر باہر نظر آتی تھی، وہ کس طرح اب مفقود ہوگئی ہے اب تو وہ صرف لین دین کرنے والوں اور قمار بازوں کی کمین گاہیں ہیں۔ نہ وہ قومی آزادی کا سرچشمہ ہیں، نہ انفرادی آزادی کا۔ اس بات کا اندازہ کہ قوم کیسی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، صرف بہادر اور بے خوف دلوں کے جذبات دیکھنے ہی سے ہوسکتا ہے۔

مولانا کے بیان کا روئے سُخن اگرچہ عدالت کی طرف ہے لیکن دراصل وہ ملک و ملّت سے خطاب کر رہے ہیں۔ فی الحقیقت ان کا بیان ایسا ہے گویا عمر بھر کے لیے سخت سخت سزاؤں کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔

ایک سال قید بامُشقت سزا کا فیصلہ سن کر مولانا نے خوب کہا:۔

''میں جس سزا کا متوقع تھا، اس سے تو یہ بہت ہی کم ہے۔''

مہاتما گاندھی (قولِ فیصل، مولانا ابوالکلام آزاد)

مولانا آزاد

مولانا آزاد کی تحریروں کا نمونہ

21-5-53

مائی ڈیر سورن سنگھ،

آپکو معلوم ہے کہ ۱۹۵۰ء میں ہم نے ایک انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز قائم کی تھی جو اگرچہ ایک نوان افیشل ایجنسی کی حیثیت سے کام کرتی ہے' لیکن اس کا تمام خرچ گورنمنٹ کے گرانٹ سے چلایا جارہا ہے۔ اس کونسل کے قیام سے انٹرنیشنل فیلڈ میں گورنمنٹ کے مقاصد کو بہت بڑی مدد ملی ہے۔

اس کونسل کا آفس نظام پیلس کے ایک حصے میں ہے جس کے کرایہ میں ہمیں ایک بڑی رقم دینی پڑتی ہے' اور پھر بھی کافی گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے ضروری کام رُکے پڑے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ جلد سے جلد کونسل اپنی الگ بلڈنگ بنالے۔

اس بلڈنگ کے لیے مناسب موقعہ پر ہمیں دو ایکڑ زمین ملنی چاہیے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ جس جگہ آرٹ اگزیبیشن بلڈنگ کے لیے زمین دی گئی ہے' وہاں خالی زمین موجود ہے اور انڈین کونسل کے لیے مل سکتی ہے۔ بہرحال اسے میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ کونسا موقعہ مناسب ہوگا۔

(A note from Azad to Sardar Swaran Singh informing that a piece of land of 2 acres was required for the construction of a building for Indian Council of Cultural Relations (ICCR), which was established in 1950.)

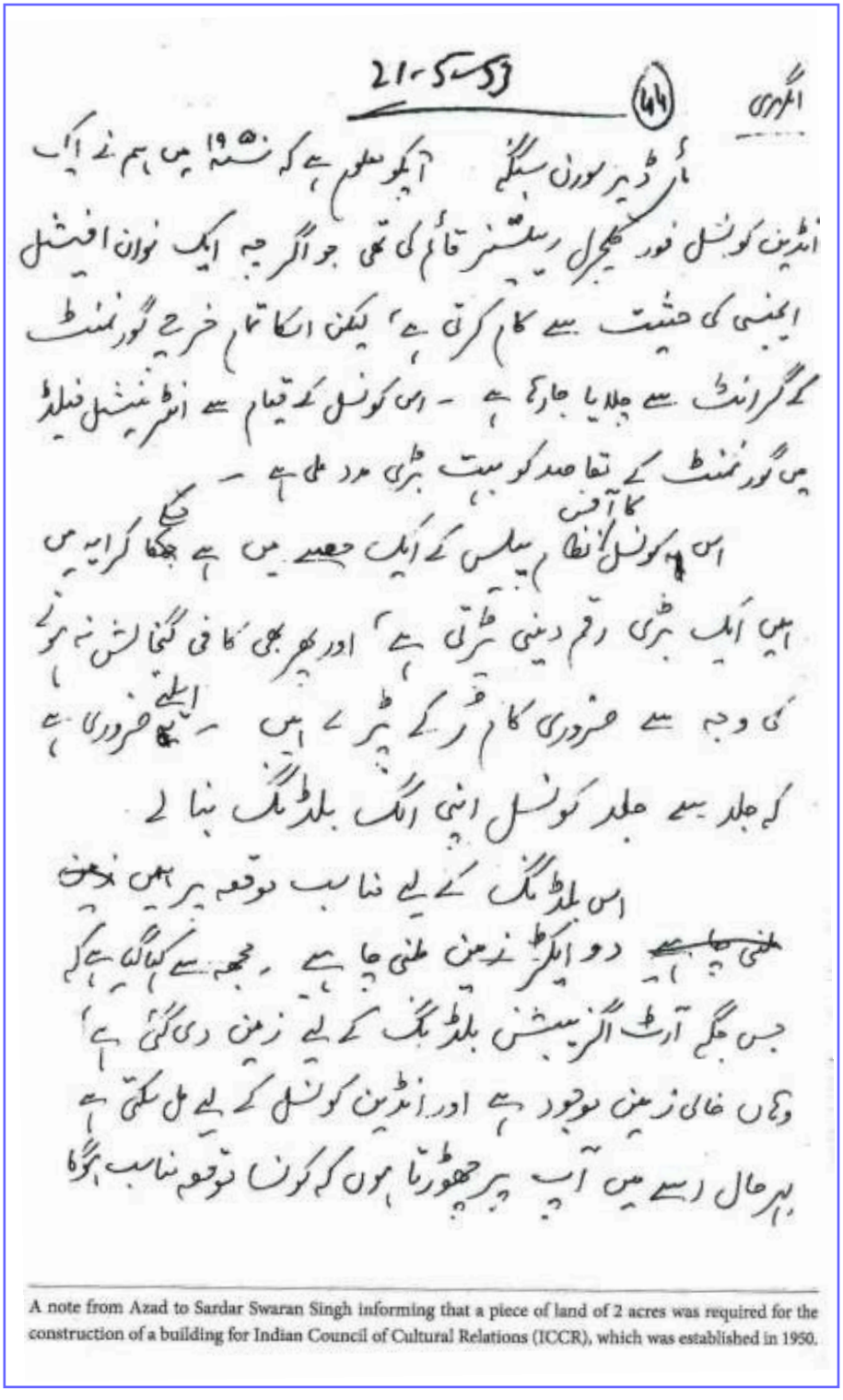

A note from Azad to Sardar Swaran Singh informing that a piece of land of 2 acres was required for the construction of a building for Indian Council of Cultural Relations (ICCR), which was established in 1950.

(Islam, Pluralism, Nationhood legacy of Maulana Azad, ed. Mushirul Hasan)

23-11-54

مائی ڈیر ڈاکٹر کاٹجو

''دارالمصنفین'' اعظم گڑھ کو جو ''شبلی ایکیڈیمی'' کے نام سے بھی پکاری جاتی ہے' ریاست بھوپال سے دو ہزار ایک سو ساٹھ روپیہ کی سالانہ گرانٹ ملتی تھی جو اسٹیٹ کے انٹی گریشن کے بعد بھی جاری رہی کیونکہ انٹی گریشن کے کنڈیشنس میں یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ ملک کے علمی اور لٹریری کاموں کے لیے اسٹیٹ جو گرانٹ دیتا رہا ہے' اُسے بدستور جاری رکھا جائیگا۔ لیکن اب اچانک اس سال اس گرانٹ کا روپیہ شبلی ایکیڈیمی کو نہیں ملا۔ اس پر انھوں نے گورنمنٹ بھوپال کو لکھا۔ بھوپال سے انھیں یہ جواب ملا ہے کہ یہ معاملہ اب سنٹرل گورنمنٹ کے سامنے گیا ہے اور وہاں غور ہورہا ہے۔

میں اس خط و کتابت کے کاغذات اس چٹھی کے ساتھ آپ کو بھیج رہا ہوں میں شکر گزار ہونگا اگر آپ اس بارے میں انکوایری کرکے حالات معلوم کرلینگے۔ شبلی ایکیڈیمی ملک کی ایک اہم ایکیڈیمی ہے اور نہایت قیمتی لٹریری خدمت انجام دے رہی ہے۔ اگر بھوپال کی یہ گرانٹ بند ہوگئی تو اسے نقصان پہنچیگا علاوہ برین یہ اُس معاہدہ کے بھی خلاف ہوگا جو بھوپال کے انٹی گریشن کے وقت ہم کرچکے ہیں۔

Note by Maulana Azad related to "Darul Musannifeen" (Shibli Academy), Azam Garh, for release of grant, dated 23-11-1954.)

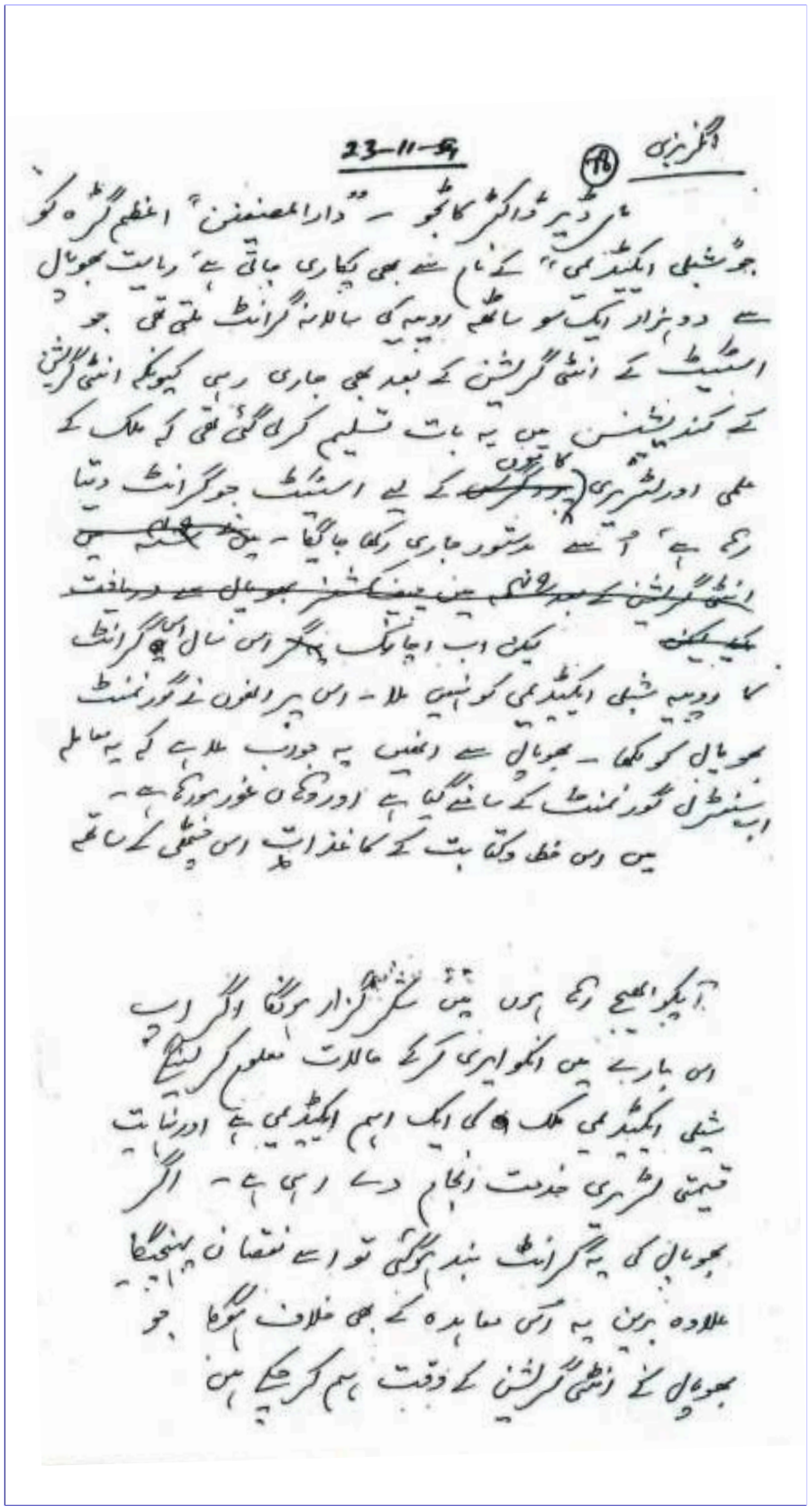

(Islam, Pluralism, Nationhood legacy of Maulana Azad, ed. Mushirul Hasan)

’ہندوستانی‘ زبان ملک کو گاندھی جی کی دین — مولانا آزاد

’’گاندھی جی نے ہندوستان کو بہت سی چیزیں دی ہیں مگر شاید کم لوگوں کا دھیان اس طرف گیا ہوگا کہ ایک بڑی چیز جو ہندوستان کو ان کے ہاتھوں سے ملی وہ اس کی ملکی زبان ہے۔ بہت سی بولیاں رکھنے پر بھی ہندوستان اپنی ملکی بولی نہیں رکھتا تھا۔ گاندھی جی نے اس کی یہ کمی پوری کر دی۔

انگریزی زبان حکومت کے دروازے سے آئی لیکن آتے ہی سارے ملک پر چھا گئی اور اس طرح چھا گئی کہ ہماری تعلیمی، علمی اور سماجی زبان کی جگہ اسی کو مل گئی۔ اب پڑھے لکھے ہندوستانی اپنی ملکی زبان میں بات چیت کرنا شرم کی بات سمجھنے لگے تھے۔ بڑائی اور عزت کی بات یہی سمجھی جاتی تھی کہ ہر موقع پر انگریزی زبان سے نکلے۔ لوگ اپنی نج کی بات چیت میں بھی انگریزی کو بھلا نا پسند نہیں کرتے تھے۔

پچھلی صدی کے آخری حصے میں ملک کی نئی سیاسی جاگرتی شروع ہوئی اور انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اب کانگریس کے جلسے اس لیے ہونے لگے کہ ملک کی قومی مانگوں اور قومی فیصلوں کی آواز دنیا کو سنائی جائے لیکن یہ آواز بھی اپنی زبان میں نہیں اٹھتی تھی انگریزی میں اٹھتی تھی۔ ہندوستان اب انگلینڈ کو یہ بات سنانا چاہتا تھا کہ اس کا ملک خود اس کے لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں ہے لیکن یہ بات کہنے کے لیے بھی اسے اپنی ہندوستانی زبان نہیں ملی تھی وہ دوسروں ہی کی زبان ادھار لے کر اپنا کام چلانا چاہتا تھا۔

لیکن جیوں ہی گاندھی جی نے ملک کے سیاسی میدان میں قدم رکھا، اچانک ایک نیا انقلاب ابھرنا شروع ہوگیا۔ اب ملک کی آواز خود اس کی زبان میں اٹھنے لگی اور ملک کی زبان میں بات چیت کرنا شرم کی بات نہیں رہی۔ انھوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ شرم کی بات یہ نہیں کہ ہم اپنی زبانیں بولیں، شرم کی بات یہ ہے کہ اپنی زبان بھول جائیں۔ انھوں نے 1920-21 میں سارے ملک کا دورہ کیا اور سیکڑوں تقریریں کیں لیکن ہر جگہ ان کی تقریروں کی زبان ہندوستانی ہی رہی۔

مجھے یاد ہے کہ پچھلی لڑائی کے زمانے میں، جب میں رانچی میں قید تھا تو میں نے اخباروں میں اس کانفرنس کی کارروائی پڑھی تھی جو سنہ 1917 میں لارڈ چیمس فورڈ نے دلی میں بلائی تھی۔ گاندھی جی اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے مگر انھوں نے یہ بات بطور شرط کے ٹھہرالی تھی کہ وہ تقریر ہندوستانی میں کریں گے۔ اس وقت اخباروں نے اس واقعے کو ایک نئی اور عجیب طرح کی بات خیال کیا تھا لیکن یہ نئی بات بہت جلد ملک کی سب سے عام بات بننے والی تھی۔ چنانچہ آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ جو جگہ پچیس برس پہلے انگریزی زبان کی سمجھی جاتی تھی وہ ہندوستانی زبان نے لے لی ہے۔‘‘

ابوالکلام آزاد

(ایوان اردو، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر 2014)

مولانا کے اس مختصر مضمون کے خاتمے پر گاندھی جی نے مضمون کے بارے میں چند جملے لکھے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ان کو بھی قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے تحریر کیا:

’’اوپر کا لکھان میری تعریف کے لیے نہیں ہے۔ جو آدمی اپنا دھرم سمجھ کر کچھ سیوا کرتا ہے اس میں تعریف کیا ہے؟ مولانا صاحب عالم ہیں۔ فارسی اور عربی کا گیان رکھتے ہیں اس لیے اردو خوب جانتے ہیں لیکن وہ مانتے ہیں کہ نہ تو عربی فارسی لدی اردو ہندوستان کی عام زبان ہوسکتی ہے اور نہ سنسکرت بھری ہندی۔ اس لیے وہ اردو اور ہندی کا میل چاہتے ہیں اور دونوں کو ملا کر بولتے ہیں۔ میں نے ان سے پرارتھنا کی ہے کہ ہر ہفتے ایک چھوٹا سا ہندوستانی لیکھ دیتے رہیں جس سے ہندوستانی کا ایک نمونہ ہر یجن سیوک پڑھنے والوں کو ملتا رہے۔ اس کوشش کا پہلا نمونہ اوپر کا لکھان ہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی

(ایوان اردو، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر 2014)

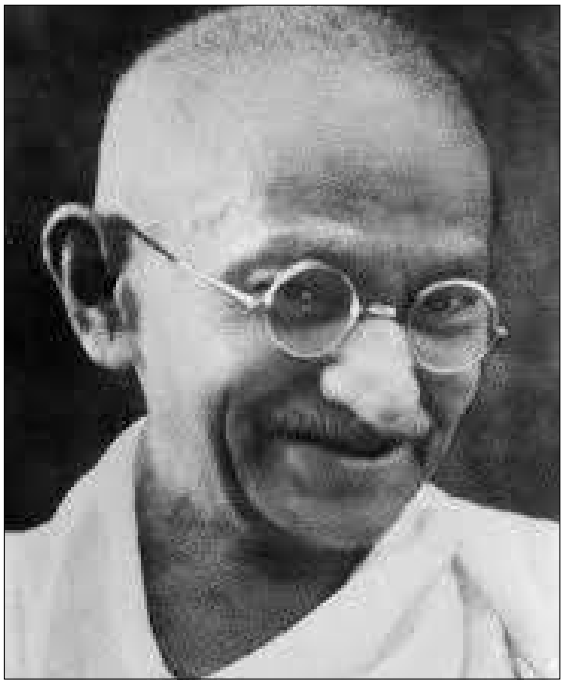

ملک کے لیے
آزادی کی بے مثال قربانیاں

وہ قید میں تھے جب ان کی شریک حیات چل بسیں

''... میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا، تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی، لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم وبیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں، لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب وہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آرہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہوگئی۔

صد بیاباں بگزشت ودگرے درپیش ست

''...گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنے ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔''

''...اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرز عمل رہا، اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتداء میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کرسکتے ہیں کریں، لیکن جوں ہی انہیں معلوم ہوگیا کہ میں نے اپنے طرز عمل کا ایک فیصلہ کرلیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سب نے خاموشی اختیار کرلی اور اس طرح میرے طریق کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔''

''...اس طرح ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

''...مجھے چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے ہیں...

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں''

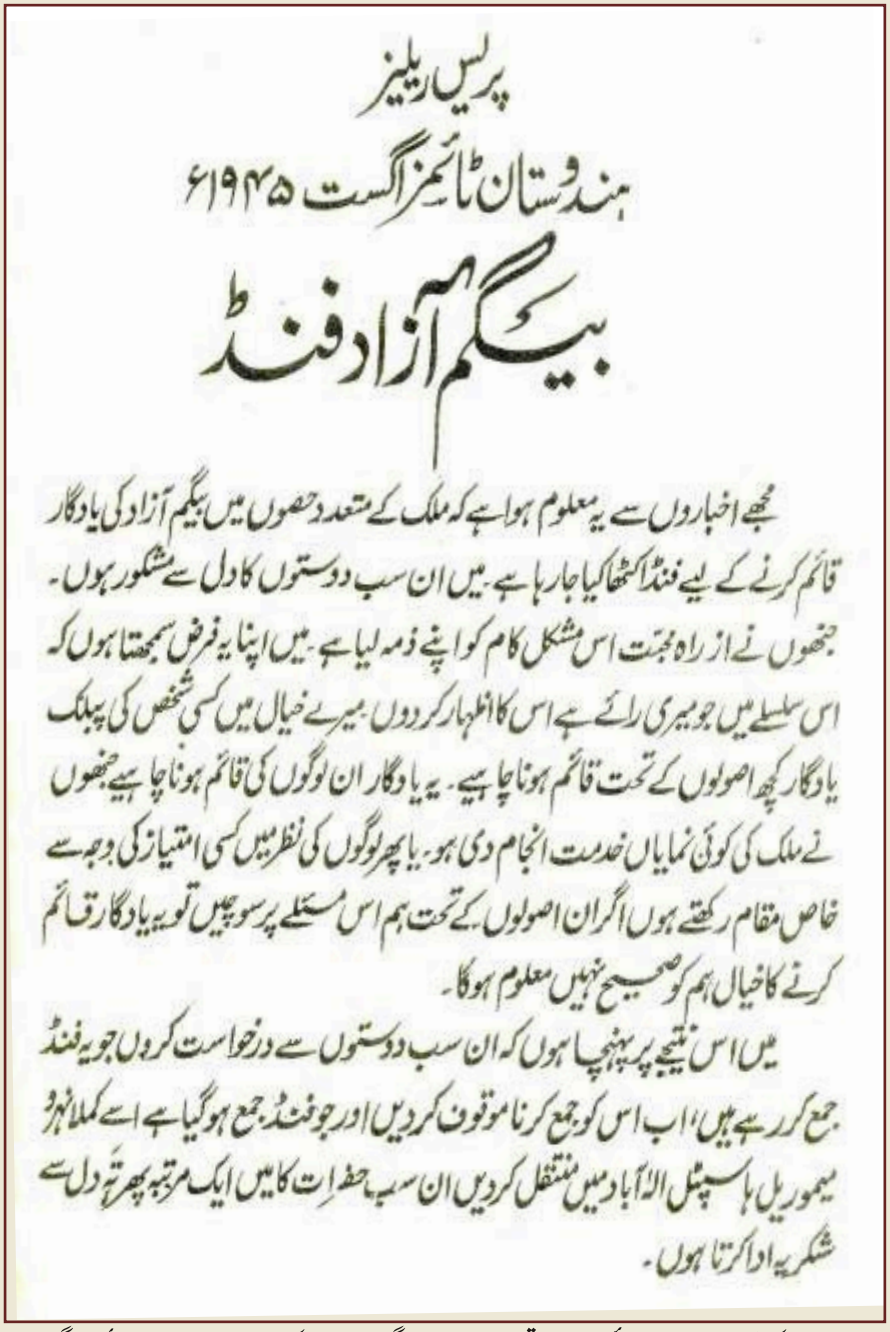

پریس ریلیز

ہندوستان ٹائمز اگست ۱۹۴۵ء

بیگم آزاد فنڈ

مجھے اخباروں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ملک کے متعدد حصوں میں بیگم آزاد کی یادگار قائم کرنے کے لیے فنڈ اکٹھا کیا جارہا ہے۔ میں ان سب دوستوں کا دل سے مشکور ہوں۔ جنھوں نے از راہ محبت اس مشکل کام کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں جو میری رائے ہے اس کا اظہار کردوں۔ میرے خیال میں کسی شخص کی پبلک یادگار کچھ اصولوں کے تحت قائم ہونا چاہیے۔ یہ یادگار ان لوگوں کی قائم ہونا چاہیے جنھوں نے ملک کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہو۔ یا پھر لوگوں کی نظر میں کسی امتیاز کی وجہ سے خاص مقام رکھتے ہوں اگر ان اصولوں کے تحت ہم اس مسئلے پر سوچیں تو یہ یادگار قائم کرنے کا خیال ہم کو صحیح نہیں معلوم ہوگا۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان سب دوستوں سے درخواست کروں جو یہ فنڈ جمع کررہے ہیں، اب اس کو جمع کرنا موقوف کردیں اور جو فنڈ جمع ہوگیا ہے اسے کملا نہرو میموریل ہاسپٹل الہ آباد میں منتقل کردیں ان سب حضرات کا میں ایک مرتبہ پھر تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ابوالکلام آزاد

جگن ناتھ آزاد

ابھی انگریز کو حاصل تھی گاندھی جی کی ہمدردی
وطن میں گونجتا تھا جب ترا نعرہ بغاوت کا
ابھی تھی منزلوں پیچھے سیاست اُس مجاہد کی
جسے ہونا تھا اک دن ہم نوا تیری سیاست کا

اگر تیری نصیحت پر عمل کرتے وطن والے
تو یہ ہندوستاں، تیرا وطن، کچھ اور ہی ہوتا
اگر تیری نوا کچھ اس چمن پر کارگر ہوتی
تو مجھ کو ہے یقیں رنگِ چمن کچھ اور ہی ہوتا

ترا پیغامِ دل لے کر ترا پیغامِ جاں لے کر
لسان الصدق آیا، الہلال و البلاغ آئے
تجلی سے مگر آنکھیں رکھیں کچھ بند ہی ہم نے
اگرچہ نور برساتے کئی روشن چراغ آئے

خلافت کا زمانہ ہے مری چشمِ تصور میں
وہ گاندھی جی کا رستہ اور تیری حوصلہ مندی
مجھے اقبالؔ کا آج ایک مصرع یاد آتا ہے
''کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی''

قیامت کے فسادوں میں گھرا جب شہرِ کلکتہ
تو اپنی جاں ہتھیلی پر لیے میدان میں آیا
بچایا ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کو بھی تو نے
خدا کی رحمتوں کا تیری تربت پر رہے سایا

اسی معدن نے تجھ سا قیمتی گوہر ہمیں بخشا
اسی کے فیض سے تجھ سے ملی ایمان کی دولت
اسی نے ہم کو آزادی کی نعمت سے کیا واقف
اسی سے پائی اہلِ شوق نے عرفان کی دولت

رہیں یک جان دو قالب کی صورت ہندو مسلم
نصیحت جو صدی کی ابتدا میں تو نے فرمائی
اسے سمجھے ہوں یا سمجھے نہ ہوں اہلِ وطن لیکن
حقیقت تھی کہ ہر پھر کر ہمیشہ سامنے آئی

تیرے افکار کی تعریف ہم کرتے رہے لیکن
حقیقت ہے کہ تیرے درد کو ہم نے نہ پہچانا
جو تیری روح میں آباد تھی اک کرب کی دنیا
اسے ہم نے نہ کچھ دیکھا، نہ کچھ سمجھا، نہ کچھ جانا

تری ہستی عبارت تھی روایت سے، درایت سے
نگاہوں میں تری دیروز بھی تھا اور فردا بھی
ترا اک ہاتھ مستقبل پہ تھا اک ہاتھ ماضی پر
کہ آئینہ تھا تجھ پر دورِ تازہ بھی، گزشتہ بھی

تجھے مذہب میں دیکھیں ہم کہ دنیائے سیاست میں
ہر اک ماحول میں ہے جلوہ فرما تیری تابانی
ادھر ہیں معرکوں سے کچھ فزوں قربانیاں تیری
ادھر اک معجزے سے کم نہیں تفسیرِ قرآنی

ہوا یہ ملک جب آزاد، تیری ہی فراست نے
جو تھے گنتی سے باہر عقدۂ دشوار، سلجھائے
ترا ہندوستاں احساں بھلا سکتا نہیں تیرے
تری قربانیوں سے جس نے اونچے مرتبے پائے

اسی نے ہم کو بخشا ہے گلِ خوش رنگ تجھ ایسا
چمک اٹھا ہے جس کے دم سے سارا بوستاں اپنا
اسی نے ہی دیا ہے پیکرِ علم و عمل تجھ سا
کہ جس کی ذات پر نازاں ہے کل ہندوستاں اپنا